رجسٹرڈ نمبر L. 922
فون نمبر ـــــ 29

ایڈیٹر
آل احمد سرور
فی کاپی بیس پیسے
قیمت سالانہ ۶ روپے
اشاعت کی تاریخیں
۱ ، ۸ ، ۱۵ ، ۲۲

یکم فروری ۱۹۷۲ء

ہفتہ وار ہماری زبان

جلد ۳۱ | انجمن ترقی اردو ہند (علی گڑھ) | شمارہ ۵

آل احمد سرور

آدت ناتھ جھا

افسوس ہے کہ آدت ناتھ جھا جو دلی کے مرکزی علاقے کے لفٹننٹ گورنر تھے، اچانک انتقال کر گئے۔ ان کی عمر ساٹھ برس کی تھی، شام کو دلی میں کسی تقریب میں شرکت کے لئے گئے۔ وہاں کچھ بے چینی محسوس ہوئی اور فوراً انھیں گھر لایا گیا۔ مگر گھر پہنچنے کے تھوڑی دیر کے بعد ہی قلب کی حرکت بند ہو گئی۔

آدت ناتھ جھا کو دلی اور الٰہ آباد اور لکھنؤ اور بنارس میں خاص و عام سبھی جانتے تھے۔ لیکن شاید اردو دوست عام طور سے ان سے واقف نہ تھے، یہ مشہور عالم اور الٰہ آباد یونی ورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر گنگا ناتھ جھا کے بیٹے اور پنڈت امرناتھ جھا کے چھوٹے بھائی تھے۔ اس مشہور خاندان کی علمی و ادبی روایات انھیں ورثے میں ملی تھیں۔ نہایت امتیازی تعلیمی دور کے بعد انڈین سول سروس کے مقابلے میں بیٹھے اور اوّل آئے۔ اعلیٰ علمی استعداد کے ساتھ غیر معمولی انتظامی قابلیت بھی رکھتے تھے، زرعی اصلاحات کے سلسلے میں انھوں نے نمایاں کام کیا۔ جب یہ چیف سکریٹری تھے تو ترائی کے علاقے کا جنگل صاف کر کے اسے کھیتی کے قابل بنایا جا رہا تھا۔ مگر ان کو ریل کا ایک انجن درکار تھا، مگر لال فیتے کی وجہ سے اس کے حصول میں دقت ہو رہی تھی وہ جھا صاحب سے ملا۔ انھوں نے کہا کہ لوکو شیڈ میں چلے جاؤ اور وہاں جو انجن ملے اسے لے جاؤ اور اپنا کام نکال لو۔ اس نے بالکل یہی کیا اور وقت پر کھیتی شروع ہو گئی، مگر سال بھر تک ریلوے بورڈ اور یو۔پی کی حکومت کے درمیان سوال جواب ہوتے رہے۔

بنارس میں جب سنسکرت وشو ودیالیہ قائم ہوا تو آدت ناتھ جھا کی سنسکرت ادب پر گہری نظر کی وجہ سے انھیں اس کا کل پتی بنایا گیا۔ اس افسر نے اس وشو ودیالیہ کو جدید معیاروں کے مطابق چلانا چاہا، مگر وہاں کے دو دوانوں نے ایک نہ چلنے دی اور یہ پھر افسری کرنے لگے۔

جب میں لکھنؤ میں تھا تو پنڈت امرناتھ جھا جب بھی وہاں تشریف لاتے تھے میں ان سے ملنے ضرور جاتا تھا۔ آدت ناتھ سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ امرناتھ جھا انگریزی کے مشہور پروفیسر تھے اور بعد میں ہندی دنیا میں بھی انھوں نے خاص شہرت حاصل کی، مگر یہ بات شاید عام طور پر لوگوں کو معلوم نہیں کہ وہ اردو کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے اور کئی اردو شاعروں پر انھوں نے انگریزی میں بڑے اچھے مضامین لکھے تھے، میر، عزیز لکھنوی، ریاض خیرآبادی پر ان کے مضامین میری نظر سے گزرے ہیں۔ ریاض کا ایک انتخاب بھی انھوں نے چھپوایا تھا۔ غرض امرناتھ جھا صاحب جب لکھنؤ آ گئے پر شعر و شاعری کی محفل جمتی تھی اور اس میں آدت ناتھ جھا بھی بہت دلچسپی لیتے تھے۔ چنانچہ جب وہ دلی میں لفٹننٹ گورنر ہوئے اور یوم غالب کے موقع پر انھوں نے ایک دفعہ خطبۂ صدارت پڑھا تو غالب کی عظمت پر انھوں نے جس طرح روشنی ڈالی اور غالب کے اچھے شعر جس طرح پڑھے، اس پر مجھے بالکل تعجب نہیں ہوا۔ سنسکرت اور ہندی سے اس قدر شغف کے باوجود آدت ناتھ جھا کو اردو سے بہت محبت تھی اور انھوں نے اردو کے اداروں کی بڑی مدد کی، غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر دلی کے انتظامیہ سے ایک گرانقدر عطیہ غالب کمیٹی کو دلوایا، جب انجمن کے اردو گھر کے نقشے کی کارپوریشن سے منظوری میں دیر ہوئی تو ہم لوگ بہت پریشان ہوئے۔ بالآخر

زیدی صاحب جو ہماری طرف سے اس معاملے میں دوڑ دھوپ کر رہے تھے، آدت ناتھ جھا کے پاس گئے اور فریاد کی کہ ان کے ہوتے انجمن کا کام رکا پڑا ہے۔ انھوں نے متعلقہ افسر کو اسی وقت ٹیلی فون کیا کہ کیا تم اردو گھر نہیں بننے دوگے؟ کل صبح تک منظوری زیدی صاحب کو مل جائے۔ خیر صبح تک تو نہیں لیکن دوسرے دن منظوری واقعی مل گئی۔

ادھر آدت ناتھ جھا کا الٰہ آباد یونی ورسٹی کی وائس چانسلری کے سلسلے میں نام لیا جا رہا تھا۔ ان کے باپ اور بھائی، دونوں اس یونی ورسٹی کے وائس چانسلر رہ چکے تھے اور دونوں نے الٰہ آباد یونی ورسٹی کے وقار کو بہت بلند کیا تھا۔ قدرتاً الٰہ آباد یونیورسٹی کے ہمدرد چاہتے تھے کہ آدت ناتھ جھا یہ ذمہ داری قبول کریں۔ مگر ہوا یہ کہ ان کی گورنری کی میعاد میں چھ مہینے کی توسیع ہو گئی۔ اب یہ توسیع ختم پر تھی تو پھر امید ہو گئی تھی کہ جھا صاحب الٰہ آباد چلے جائیں گے اور اپنی یونی ورسٹی کی بھی کچھ خدمت کریں گے۔ مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ ساٹھ برس کی عمر بھی کوئی مرنے کی عمر ہوتی ہے۔ وہ خاصے موٹے تھے۔ کام بھی بہت کرتے تھے اور ہمارے یہاں انتظامیہ کے افراد کا کوئی وقت اپنا نہیں ہوتا اور وہ کسی طرح باقاعدہ زندگی نہیں گزار سکتے۔ جھا صاحب غالباً کام کی اس کثرت کو برداشت نہ کر سکے۔ انھوں نے دلی میں بڑی شان سے حکومت کی۔ دلی کو خوبصورت بنانے میں بھی ان کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ انھوں نے دلی کے سبھی علمی و ادبی اداروں کی مدد کی۔ وہ ہندوستان کی سبھی قومی زبانوں سے محبت کرتے تھے اور ان کی ترقی کے خواہاں تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جن کا احترام بھی کیا جاتا ہے اور جن سے محبت بھی ہو جاتی ہے۔ ملک کو جھا صاحب جیسے صاحب نظر، معاملہ فہم اور پر خلوص انسانوں کی بڑی ضرورت ہے جو ہماری ساری تہذیب اور ساری تاریخ پر فخر کریں اور جو خود بھی کام کر سکتے ہوں اور دوسروں سے بھی کام لے سکتے ہوں۔

(کالم ۲ سے آگے)

اپنی تیغ سے یارو کون زخم کھاتا ہے

ہم سبھی سہولت کو فلسفہ بناتے ہیں

پروفیسر آل احمد سرور، صدر مشاعرہ کی کامیاب غزلوں کے بعد خواجہ مسعود علی ذوقی نے حاضرین کے شکریے کے ساتھ مشاعرے کے اختتام کا اعلان کیا۔ اس کے بعد اردو سیمنار میں شعرا نے چائے پی اور دیر تک خوشگوار ماحول میں مشاعرے پر تبصرہ ہوتا رہا۔ اس بات سے سبھی متفق تھے کہ یہ محفل انتہائی پر سکون، خوبصورت، ذہین، زندہ اور خوشگوار تھی۔

(نامہ نگار)

(باقی صفحہ ۱۱ سے آگے)

حقیقت کو پیش کیا گیا ہے کہ دونوں جگہ 'ESTEBLISHMENT' فرد کی تمام خوبیوں کا استعمال کرتا ہے اور اسے بازار کی جنس بنا کر خرید و فروخت کرتا رہتا ہے۔

اب وحید اختر اپنے ان اشعار سے داد تحسین حاصل کر رہے ہیں۔

جن کے چہروں پہ چمک نور کا ہالہ اطراف

ان کے ذہنوں کو جو کھولا تو اندھیرا دیکھا

جن کے تیشوں کو رہا کوہ کنی کا دعویٰ

انھیں محلوں کا بھی کرتے ہوئے پہرا دیکھا

عمر کل گزری تھی پڑھتے ہوئے چہرہ تیرا!

آج ڈھونڈا تو کہیں عکس نہ تیرا دیکھا

اس غزل میں کچھ قطعہ بند اشعار تھے جن میں شہر آشوبی رنگ تھا۔

ادب و فلسفہ و علم تلاش موہوم — سب میں الفاظ و بیان اور بیاں کچھ بھی نہیں

زندگی کوئی صحیفہ نہیں جب چاہو پڑھو — چھکے اک پل تو یہ تحریر رواں کچھ بھی نہیں

وحید اختر کو داد تو سبھی دے رہے تھے مگر اطہر پرویز بہت زیادہ بلند آہنگ ہیں۔

اب خواجہ مسعود علی ذوقی نے اپنی غزل شروع کی ہے۔

وہ قربان خیال کی سب انگنیں کہاں

خالی پڑا ہے ذہن کا بے رنگ آشیاں

اک نور کا غبار ہے تا حدِّ آسماں

بکھری ہوئی سحر پہ ہے شکست کا گماں

داد کی فراوانی ہے۔ اب صدر مشاعرہ پروفیسر آل احمد سرور نے عصری زندگی کو شعری پیکروں میں پیش کرنا شروع کیا۔ سرور صاحب کے دلکش اشعار، ان کی پر نور شخصیت اور سننے والوں کی عقیدت۔ وہ سماں گفتنی نہیں دیدنی تھا۔ جب یہ اشعار پڑھے گئے۔

مال موسم کا بہت ملتا ہے بازاروں میں

ہاں مگر میرے سوا سب ہیں خریداروں میں

جو بھی چلتی ہوئی گاڑی میں اسی پر چڑھ جائیں

آج ایسے ہی گنے جاتے ہیں ہشیاروں میں

اور جب یہ شعر پڑھا تو بڑے بڑے خفتہ دل چونک کر جاگ پڑے۔

اس کو چاہا ہے اسی سے ہے ہمارا جھگڑا

ہم سے کہتے ہیں علی گڑھ کے دلداروں میں

اور دوسری غزل میں درد کی تہذیب کی کسک تھی۔

خواب دیکھے دالو خواب ٹوٹ جاتے ہیں

پھول کی تمنا میں زخم ہاتھ آتے ہیں

چپ رہیں تو دل اپنا کچھ خفا سا رہتا ہے

سچ کہیں تو ساتھی بھی ہم سے روٹھ جاتے ہیں

(باقی کالم ۱ پر)

ڈاکٹر نورالسعید اختر

قصہ نل دمنتی کا ایک نادر مخطوطہ

قصہ نل عن پال دمنتی مہابھارت کے مشہور قصوں میں سے ہے۔ اس سنسکرت الاصل قصے کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس قصہ کو تقریباً تمام مشرقی زبانوں نے اپنایا۔ دیگر زبانوں میں بھی اس کے ترجمے پائے جاتے ہیں۔

اسی قصے پر مبنی ایک نہایت دیدہ زیب اور بیش بہا مخطوطہ پرنس آف ویلز میوزیم بمبئی میں بھی موجود ہے۔ یہ اودھی زبان میں ہے۔ اس مخطوطے پر مندرجہ ذیل نوٹ لکھا ہوا ہے۔

"THE STURY OF NAL AND DAMYANTI BY SURDASA IN AVDH DIALECT OF HINDI WRITTEN IN PERSIAN CHARACTER. THE PRESENT COPY WRITTEN BY BABULLAH FOR ONE MIAN DILIR KHAN IN IHOAH, IE. 1698. A.D."

مخطوطے کے تفصیلی مطالعے کے بعد چند اہم نکات سامنے آتے ہیں اور مندرجہ بالا نوٹ کے تشنہ ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ دراصل میوزیم کے ماہرین نے اس مخطوطے کے متن اور تحقیقی مطالعہ کو ضروری نہیں سمجھا۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ مخطوطہ ان کے نزدیک ادبی لحاظ سے کم اور آرٹ کے لحاظ سے زیادہ اہم ہے۔ اس میں دکنی اسکول سے متعلق نہایت خوبصورت چونسٹھ پینٹنگز (PAINTINGS) موجود ہیں۔ دکنی آرٹ کے پس منظر میں ان تصاویر کی حیثیت پر ایک علیحدہ مضمون قلمبند کیا جاسکتا ہے۔ اس مخطوطے کے نادر و نایاب ہونے کا یہی راز ہے اور غالباً فارسی رسم الخط میں دنیا کا واحد نسخہ ہے۔

مخطوطے کا تعارف۔ اس مخطوطے میں کل ۲۴۴ صفحات اور سائز ۱۰×۸ ہے۔ تصاویر والے صفحات کو چھوڑ کر ہر صفحہ تیرہ سطری ہے۔ مخطوطے کی ابتدا ان اشعار سے ہوتی ہے ؎

ابتدا۔

سمروں داتا دو جو کیسے — او انت بن اکی سو ہے
جاہ نہ برن نہ روپ نہ ریکھا — الکھ کت اسیکھ نستھ بھیکھا
ستھل نہ چنچل بدا نہ چھوٹا — نرن نہ بودھ ھانا نہ موٹا
بھت نہ تھورا سیجا نہ بہوتا — بلا نہ بچھرا جرا نہ ٹوٹا
جیون کو چہ تیوں کا ناؤں نہ ٹوبا — ناؤں جو دھرے دھرے تنھ ناؤں

صفحہ نمبر گیارہ پر ذیل کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کور دھند اس نامی شخص نے جس کا تخلص سور داس تھا، اس قصے کو نظم کیا تھا ؎

سور داس تج ناؤں بتاؤں — کور دھند اس بتا کر ناؤں
کنبو کوت تا چیلے تا سو — کلا نوز پر کہن کو باسو

صفحہ نمبر تیرہ پر صرف ذیل کا شعر درج ہے۔ لیکن اسی صفحہ پر جو تصویر بنی ہوئی ہے وہ اس مخطوطے کی سب سے زیادہ خوبصورت تصویر ہے۔ اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ چند خوبصورت پرندے ایک جھرنے کے کنارے بیٹھے ہوئے ہیں اور اپنی اپنی بولی میں "رس بھاکھا" بول رہے ہیں ؎

جب بیٹھے پنچھی تن ساکھا — بولنے سبھی ہم رس بھاکھا

صفحہ نمبر ۸۲ پر راجاؤں کی "اندر سبھا" کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے ؎

راجا راؤ جری سب آئے — سب مل کر سندر سبھا جائے
کہو سبھا سو کہت جب تینے — تب وہ ایک سبھا اوتہ بنیے
اندر سبھا برنے جگ جنھیں — دیجے اور نہ تا او پر انھیں
سو وہ اندر بھیو ایک اورا — تب پائے جب بھرے دشمن دورا
سندھیں لیت اوتہ چہوں پاسا — جیون باسا سب ہم اکاسا
کنچن چمک جیت چوری — سو کہا مردر سبھا پوری
راجا کنک کنول سے پھولے — من سب کے مدکر ہو کے بھولے
ایکے کنول باس سب باسی — سنگل ایک پانب کے پیاسی
ایکو میت سبن کے جنیں — مانتے سب سے ایک دیکھیں

صفحہ نمبر ۲۴۴ پر قصے کا اختتام ان اشعار پر ہوتا ہے ؎

پن پرسن من ہوے سب بولے — انت ہوے جو جھنڈ کے سوبے
بھلے بھیجے نادرین زیادا — بد نشان بر تجھ برن مدادا

اس کے بعد سور داس نے اختتامیہ چند اشعار لکھے ہیں جن میں سور داس کا یہ اعتراف موجود ہے کہ دراصل سور داس کی زبان پنجابی ہے اور وہ پوربی زبان سے بھی پوری طرح واقف ہے۔ لہٰذا اس نے "عشق و فراق" کی اس داستان کو زیادہ مقبول بنانے کی خاطر "بھاکھا" میں بیان کی ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار کافی غور طلب ہیں ؎

یار و ابھد کچھ میں اکھیا
عشق فراق پوربی بھاکھیا

مت جان یہ پورب وکھا
پورب دیس پنجابی جھتا
ہوں اپنی بھاکھا بھی جاناں
نکتا نکتا سب پہچانوں
اس بھاکھا وچ شعر کہیا
عشق حقیقت لکھے میرے
اس اپنے بھاکھا وچ بالی
تی بھلی یہ کو دھ ستالی
بوددی مرمیں کل جو گیے
جس کس تاسوں جانے دیجے

باج پنجاں سور بجانے رتن پارکھی رتن پہچانے
ادت بھاکھا محرم سب کوئی پڑھے جو طلب بجھے سوئے
تس کارن یہ پریم کہانی پورب دیس بھاکھا وچ آنی
بانگ بانگ (؟) پنچھیا سو بھلا جو سبھی سانجھا ہوئی
بانی تس بھاکھے بھلے جنہو بجھے سب کوئی

ان اشعار کے بعد یہ فارسی رباعی لکھی ہوئی ہے سہ

برائے صاحب کتاب یارب در ہائے مراد و فیض بکشائی
ہر کاتب و ہر کہ خواند این را رحمت کن در راہ راست بنمائے

ترقیمہ فارسی میں ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ کسی دلیر خان کی فرمائش پر ۱۱۱۳ھ مطابق سنہ میں باب اللہ ولد سید محمد زاہد حسینی الحسینی البخاری الحنفی نے (۴۳ ویں سن جلوس اورنگ زیب) میں نقل کیا۔ ترقیمہ اس طرح ہے۔

۔ اتمام یافت نسخہ عشق افزائی شوق انگیز مجموعہ غم زدا اس لطافت آمیز معدن راز و نیاز منبع حقیقت و مجاز فیض بخش ارباب شوق راحت دہ اصحاب ذوق بتاریخ چہارم در شوال روز یکشنبہ بوقت ظہر بموافق امر صاحب زادہ والا قدر بلند اقبال عالی ہمت پسندیدہ خصال، جواں طالع، سعادت نشان، رستم دقت، حاتم زماں مسند نشین مسند فتوت و مروت۔ مہربان، مشفقی میاں دلیر خاں سلمہ اللہ تعالیٰ بخط احقر الناس نیاز مند باب اللہ ولد سید محمد زاہد حسینی الحسینی البخاری، الحنفی در سنہ ۱۱۱۳ھ یکہزار و یکصد و دہ ہجری و چہل و سوم از جلوس میمنت مانوس اورنگ زیب عالمگیر بہادر بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ دست داد از فضل علی الخالقین برہ و احسانہ

اس کے بعد پنجابی زبان کا ایک قدیم دوہرہ ہے :۔ ایک سہنس ایک سیکرا ایک دہا کا کال ہجرت سون بیتے جیتے لکھے گئے
نت کال سو یہہ نل داس کہ سیم اتم سنپورن لکھیو ہوئے کمراد کہیم جو بات جی کے جب درسین (۹)

ثاقب کانپوری

حشرِ جذبات

اب عشق کا انجام میں کچھ سوچ رہا ہوں
ہاں اے ہوسِ خام میں کچھ سوچ رہا ہوں

خالی ہوئے سب جام نہیں کوئی بھی میکش
اے دردِ تہِ جام میں کچھ سوچ رہا ہوں

کس طرح جدائی میں کٹے گی یہ مری رات
فرقت میں سرِ شام میں کچھ سوچ رہا ہوں

جی بھر کے تجھے آج میں دیکھوں کہ نہ دیکھوں
اے حسنِ لبِ بام میں کچھ سوچ رہا ہوں

اپنے دلِ تنہا سے میں خود ہوں پریشاں
کیا دوں انھیں الزام میں کچھ سوچ رہا ہوں

میرے لئے محبوب کی زلفوں کی ہوا ہاں
اے گردشِ ایام میں کچھ سوچ رہا ہوں

تارے سے چمکنے لگے تاریک فضا میں
ہاتھوں میں لئے جام میں کچھ سوچ رہا ہوں

کچھ پاس نہیں میرے بجز حسرت و حرماں
کیا دوں انھیں انعام میں کچھ سوچ رہا ہوں

وہ مجھ سے تباہی کا سبب پوچھ رہے ہیں
ہے ذہن میں اک نام میں کچھ سوچ رہا ہوں

اک وہ بھی زمانہ تھا کہ فارغ تھا میں ثاقب
اب تو سحر و شام میں کچھ سوچ رہا ہوں

باقی صفحہ ۵ سے آگے

مرتب نور السعید اختر

میرے خیال میں تاج الحقائق شاہ میراں جی شمس العشاق یا ان کے خاندان کے کسی بزرگ نے ترتیب دیا ہے معرفت الٰہی کا درس کسی مولانا یا ملا کے بس کی بات نہیں۔

دکنی ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات سے گزارش ہے کہ تاج الحقائق کے بارے میں اپنے خیالات سے آگاہ کریں۔

ہانسی ۔ • قیوم صادق

—×—×—

مراسلات

ناظم خط کتابت اردو کورس جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام دو خط

(۱)

مجھے دسری (دوسری) کتاب حاصل کیے خریب (قریب) میں سب سبق غور سے پڑھتا رہا۔ سبق پڑھنے میں کوئی ملکیف (تکلیف) نہیں محسوس کیا۔ بلکہ بنا دیکھے بغیر لکھنے میں کچھ مشکل محسوس ہوا۔ ٹر کا اور ڑ میں فرق کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ نظم بہت اچھے لگے۔ شعر کو سمجھنے کے لئے آپ کھلے الفاظ میں اگر کچھ لکھ دے ڈالتے تو اچھا ہوتا۔ ایسے لفض (لفظ)، سمجھنا مشکل ہو گیا جیسا کہ

(۱) ابتدائے عشق (۲) غافل (۳) مرزا غالب صاحب کا کلام بالکل سمجھ میں نہیں آیا۔

اشعار کا انداز ٹھیک ہی نظر آیا۔ لیکن پورے اشعار کے معنی سمجھ میں نہ آئی آپ کے دئے گئے خطوط کے نمونے پڑھنے کے بعد میں انھیں کے ڈھنگ میں اپنا خط لکھ رہا ہوں۔ اس کتاب میں لکھاوٹ (لکھائی) کے نمونے بھی درج کرنا چاہئے۔ اردو کی شکل جدا جدا معلوم ہوتی ہے۔ بعض لکھاوٹ (لکھائی) کے نمونے دیکھنے میں آئے۔ ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ جیسا ہندی اور انگریزی زبان میں۔ میں پہلی بار کوشش کر رہا ہوں۔ اردو میں آپ کو خط لکھنے معلوم نہیں یہ طریقہ کہاں تک درست ہے، آپ اس پر غور و فکر فرمایے اور صحیح انداز میں ہدایت دیجئے۔ اس خط کے پیچھے بہت کچھ ہندی میں لکھوں گا۔

آندھرا پردیش • سید احمد بشیر

(۲)

زیدن ہے کہ میں نے آپ کی بھیجی ہوئی دوسری کتاب پڑھ لی ہے۔ اس کے پڑھنے میں جو مجھے دقت آئی وہ میں نے ایک جان کار آدمی سے پوچھ لیا تھا۔ اب میں پڑھ تو لیتا ہوں۔ لیکن تیز نہیں۔ میں نے یہ دودفا پڑھ لی ہے۔ میں تیز نہیں لکھ سکتا۔ جب لکھتا ہوں کوچھ کچھ غلط ہو جاتے ہیں میں ہر روز لکھنے کی مشق جاری رکھتا ہوں۔

اب مہربانی کر کے مجھے خط کتابت کی تیسری کتاب بھیج دی جائے آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔

دھان وال دھولہ۔ • بہادر سنگھ

تاج الحقائق کا مصنف...؟

یہ بات ابھی تک ثابت نہیں ہو سکی کہ تاج الحقائق کا مصنف کون ہے۔ کس نے لکھا ہے۔ کیا یہ کتاب ترجمہ ہے یا اصل ہے۔ کچھ اندازہ نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر عبدالحق و ڈاکٹر زور صاحبان نے اس کا ذکر کیا تھا کہ میراں جی یا ملا وجہی کی تصنیف ہے۔ لیکن انھوں نے بھی پورا ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے خاموشی اختیار کی۔ ڈاکٹر عبدالحق نے قطب مشتری، سب رس، شائع کروائی۔ اگر ان کو یقین ہو جاتا اور ثبوت مل جاتا تو کبھی کی "تاج الحقائق ملا وجہی کے نام سے شائع ہو جاتی۔

تاج الحقائق کے کئی نسخے ملتے ہیں لیکن ابھی تک ہم دکنی نثر کی اتنی بلند پایہ کتاب کا مصنف کون ہے جان نہیں سکے کس زمانہ کا ہے کس عہد میں تھا۔ کب پیدا ہوا۔ کب مرا۔ کچھ بھی نہیں معلوم ہو سکا۔ اور یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ اس کا نام تاج الحقائق ہی ہے۔ کتاب میں تین چار نام ایک ساتھ ملتے ہیں۔

"کتاب تاج الحقائق" رواج الحقائق، سراج الحقائق، معراج الحقائق"

ڈاکٹر نور السعید اختر نے جو حال ہی میں تاج الحقائق مرتب کی ہے اور شائع کی ہے (جو کہ ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ) وہ بھی ملا وجہی کو تاج الحقائق کا مصنف پیش کرنے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں۔

صاحب موصوف نے سو صفحات تاج الحقائق کا مصنف ملا وجہی کو ثابت کرنے کے لئے صرف کئے ہیں لیکن ان صفحات کا مطالعہ کرنے کے بعد بھی کوئی نئی بات نہیں معلوم ہوتی۔ نہ ملا وجہی کی تاریخ پیدائش معلوم ہو سکی نہ اس کا وطن نہ خاندانی حالات، نہ تاریخ وفات۔

فرض کرو کہ اس کتاب کا نام تاج الحقائق ہی ہے تو اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب کسی مرشد کامل نے اپنے مریدوں کے لئے لکھی ہے۔

اس کتاب میں عربی، فارسی، گجراتی، مرہٹی زبانوں کا استعمال بہت زیادہ ملتا ہے۔ کتاب شروع ہوتی ہے اس جملے سے "کلام مولانا وجہی الدین محمد صلی علی محمد جیو کی بات میں سند"

اس کے بعد کہیں وجہی الدین کا ذکر نہیں ملتا۔ اگر ملا وجہی کا کلام ہوتا تو وہ اپنا ذکر دوسری جگہوں پر بھی ضرور کرتا کیونکہ دونوں کتابوں میں اس نے کئی جگہ ذکر کیا ہے۔ اپنے اشعار استعمال کرتا لیکن اس میں اشعار بالکل ہی نہیں ملتے۔

ملا وجہی مرید ضرور تھا لیکن مرشد کامل نہیں تھا اور نہ اس کے مریدوں کا کہیں ذکر ملتا ہے۔ لیکن اس کتاب میں مریدوں کو تلقین دی گئی ہے۔

دو جگہوں پر شمس العشاق لکھا ہوا ملتا ہے۔

"..... ہمیں سلطان العشاق (شمس العشاق) ہیں یوں ہماری ارشاد ہے" (تاج الحقائق مطبوعہ صفحہ ۱۶۳) مرتب نور السعید اختر۔

"کیا واسطہ کہ ہمیں ہاتف العشاق ہیں، ہمیں ہادی العشاق ہیں، ہمیں عشق العشاق (شمس العشاق) ہیں ہماری بات حق ہے صحیح ہمیں کہتیں ہیں سو حق ہے" (تاج الحقائق مطبوعہ صفحہ ۲۲۷)

(باقی صفحہ ۱۴ پر)

اخبار و اذکار

شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں سرسید اور دورِ حاضر پر سیمینار

شعبۂ اردو مسلم یونی ورسٹی کے زیرِ اہتمام سرسید اور دورِ حاضر کے عنوان پر ایک سہ روزہ سیمینار ۱۵ جنوری سے شروع ہوا سیمینار کا افتتاح پروفیسر محمد مجیب وائس چانسلر جامعہ ملیہ نے فرمایا اور اس کے پہلے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر عبد العلیم نے کی۔ اپنی تمہیدی تقریر میں پروفیسر آل احمد سرور نے فرمایا کہ علی گڑھ میں سرسید کو ہم نے ایک مقدس ہستی تو سمجھ لیا لیکن ان کے افکار کو فراموش کر دیا سرسید کی شخصیت اور کارناموں کا تقاضا یہ ہے کہ ان کی اہمیت اور معنویت کا برابر تنقیدی مطالعہ کیا جائے اور موجودہ دور کی ضرورت بات کی روشنی میں نئے سرے سے ان کا جائزہ لیا جائے اسی غرض سے اس سیمینار کا انعقاد ہو رہا ہے۔ پروفیسر محمد مجیب کا خیر مقدم کرتے ہوئے سرور صاحب نے فرمایا کہ ہمارے شعبہ کو فخر ہے کہ جب بھی ہم نے مجیب صاحب کو دعوت دی وہ اپنی مصروفیات کے باوجود تشریف لائے وہ ہمارے چوٹی کے دانشوروں میں ہیں اور آج بھی ذاکر صاحب کے تعمیر کئے ہوئے جامعہ ملیہ کے خاکے میں رنگ بھرنے اور علم و ادب کے نئے چراغ روشن کرنے میں مصروف ہیں سرور صاحب کی مختصر تقریر کے بعد پروفیسر مجیب نے افتتاحی خطبہ پڑھا انھوں نے کہا کہ آج کل کئی ممتاز لوگوں پر سیمینار ہو رہے ہیں یہ ایک اچھی علامت ہے اور اسی سلسلہ کی کڑی سرسید پر یہ سیمینار بھی ہے۔ انھوں نے کہا کہ سرسید نے جو راستہ ہمیں دکھایا تھا وہ آگے چلنے کے لئے تھا بیٹھ جانے کے لئے نہیں۔ سرسید نے تقلید سے انکار کیا اور قرآن کی روشنی میں عمل صالح کی ذمہ داری افراد پر ڈالی اس بات کی ضرورت ہے کہ سرسید کے دکھائے ہوئے راستے اور ان کے کارناموں کا مطالعہ عصر حاضر کے مسائل کو سامنے رکھ کر کیا جائے۔ پروفیسر مجیب کے خطبہ کے بعد پروفیسر خلیق احمد نظامی نے "سرسید کی فکر اور عصر جدید" کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ آج ۸۰ برس بعد بھی سرسید کی بنیادی فکر اور ان کے بارے میں جو غلطیاں راہ پا گئی تھیں ان کا ازالہ نہ ہو سکا انھوں نے سرسید کی تصانیف اور ان کے کارناموں کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ سرسید نے مذہب کے ایک سیکولر تصور کو عام کرنے کی ابتدائی کوششیں کیں انھوں نے پہلی بار ہندوستان میں وحدت ادیان پر زور دیا اور ادب برائے زندگی کے تصور کی تبلیغ کی۔ اس کے بعد پروفیسر مسعود حسین خاں نے اپنا مقالہ "اردو زبان کے متعلق سرسید کے افکار اور ان کی معنویت" پڑھا جس میں کہا گیا تھا کہ سرسید نے مدرسۃ العلوم میں انگریزی اور اردو دونوں کو مناسب جگہ دی تھی لیکن حالات کے ساتھ ان کا ذریعہ تعلیم کا تصور بدلا لیکن جب بھی ورناکیولر کی بات کی گئی انھوں نے اردو زبان کا نام لیا اس لئے اس یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اردو ہونا چاہئے۔ مقالے کے بعد پروفیسر آل احمد سرور نے فرمایا کہ اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ابتداً سرسید کا خیال اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا تھا لیکن مدرسۃ العلوم کے قیام اور اس کی مصروفیات کی بنا پر ان کے نقطۂ نظر میں تبدیلی پیدا ہوئی اس لئے ہمیں ان کے بنیادی خیالات اور آج کی ضرورتوں کو ذہن میں رکھنا چاہئے ترجمہ کی دشواریوں کا ذکر کرتے ہوئے سرور صاحب نے کہا کہ دنیا کی زبانوں میں بہت کچھ ترجموں کے ذریعہ ہوا ہے لیکن یہ درست نہیں کہ محض ترجموں ہی سے سب کچھ ہوا ہے اس لئے صرف ترجموں پر تکیہ کر لینا مناسب نہیں ہوگا انھوں نے کہا کہ آج کل کے حالات کو دیکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اردو کے ذریعہ اعلیٰ تعلیم نہ صرف ممکن ہے بلکہ ضروری بھی ہے اس سلسلہ میں ہمارا فرض یہ ہونا چاہئے کہ ہم سرسید کے مجموعی خیالات کو دیکھیں۔ جناب سعید اللظفر چغتائی نے کہا کہ ذریعہ تعلیم کا مسئلہ اب عملاً ہمارے سامنے آ چکا ہے اور یہ برابر محسوس ہو رہا ہے کہ طلبہ کو انگریزی کتابیں پڑھنے اور لکچر کو سمجھنے میں کافی دشواری ہوتی ہے اس لئے یہ ناگزیر ہو گیا ہے کہ اعلیٰ سطح پر بھی ذریعہ تعلیم مادری زبان ہو اس موقع پر ڈاکٹر عبد العلیم نے کہا کہ ذریعہ تعلیم کے سلسلہ میں اس یونیورسٹی میں جو کچھ کیا جائے گا اس میں سرسید کے بنیادی افکار ہی رہنما ہوں گے۔ اس کے بعد جناب عتیق احمد صدیقی نے اپنا مقالہ "سرسید کا لسانی اسلوب" پڑھا سرسید کے اسلوب کا تجزیہ کرتے ہوئے انھوں نے یہ واضح کیا کہ سرسید نے الفاظ کے انتخاب اور ان کی دروبست سے اپنی بات واضح کرنے میں مدد لی اور اردو زبان کو مختلف مضامین کے لئے استعمال کر کے اس کے پوشیدہ امکانات کو بروئے کار لائے۔ جناب نادر علی خاں نے اپنے مقالے میں اس غلط فہمی کا ازالہ کیا کہ آثار الصنادید کے پہلے اور دوسرے اڈیشن میں سرسید کے اسلوب میں کوئی نمایاں فرق ہے۔ اصغر عباس نے اپنے مقالے "سرسید — جدید اردو تنقید کے معلم اول" میں اس بات کی صراحت کی کہ عقلیت، استدلال، خلوص اور وضاحت تنقید نگاری کے بنیادی لوازم ہیں اور حالی سے قبل سرسید پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس جانب متوجہ کیا۔

سیمینار کا دوسرا اجلاس ۱۶ جنوری کو ۱۰ بجے صبح شروع ہوا جلسہ کی صدارت جناب فضل الرحمٰن صاحب پرو وائس چانسلر نے فرمائی سب سے پہلے مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے سرسید کے مذہبی افکار پر مقالہ پڑھا جس میں انھوں نے کہا کہ سرسید نے مذہب میں قیاس اور اجماع کو رد کر کے اجتہاد کے لئے

عملاً راستہ مسدود کر دیا حالانکہ اجماع اور قیاس تقریباً ایک ہی چیز ہیں اجماع ایک اجتماعی خیال ہے اور قیاس انفرادی سرسید نے خود اجتہاد کیا ہے لیکن ان کا اجتہاد اجتہاد بندہ ہو کر رہ گیا ہے انھوں نے اجماع کے مسائل کو حل کرنے کے لئے ایک ایجنسی کی ضرورت پر زور دیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر عالم خوندمیری نے سرسید کے مذہبی طرز فکر پر مقالہ پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ سرسید نے مذہب کے سلسلہ میں چند رہنما اصول پیش کئے ہیں اور انھیں کی روشنی میں اپنے افکار کی عمارت تعمیر کی ہے انھوں نے کہا کہ سرسید نے مذہب کا ایک فعال تصور پیش کیا وہ مذہب میں اخلاقی قدروں (ETHICAL NORMS) پر زیادہ زور دیتے تھے ان کے یہاں وحی کا تصور بھی دوسروں سے مختلف تھا انھوں نے کہا کہ ہماری مذہبی زندگی میں کوئی بحران پیدا نہیں ہوگا اگر ہر شخص اپنا حکم بن جائے اس کے بعد ڈاکٹر ضیاء الحسن فاروقی نے اپنا مقالہ "سرسید کے مذہبی افکار" پڑھا انھوں نے اپنے مقالہ میں زور دیا کہ ہمیں تقلید کو چھوڑ کر عہد حاضر کے علوم سے مطابقت پیدا کرنی چاہئے۔

سیمنار کا تیسرا اجلاس ۱۶ر جنوری کو سہ پہر میں پروفیسر آل احمد سرور کی صدارت میں شروع ہوا سب سے پہلے ڈاکٹر وحید اختر نے اپنا مقالہ سرسید کا تصور مذہب پڑھا مقالہ میں ڈاکٹر وحید اختر نے کہا کہ سرسید کے سامنے اصل مسئلہ مسلمانوں کی تعلیم نو کا تھا اسی لئے مذہب ان کے یہاں بنیادی اہمیت نہیں رکھتا بلکہ اس کی حیثیت ان کے پروگرام میں ایک ضمیمہ کی ہے اس مقالہ کے بعد ڈاکٹر شان محمد نے سرسید کے سیاسی افکار اور موجودہ دور میں ان کی معنویت کے عنوان سے مقالہ پڑھا انھوں نے کہا کہ سرسید نے متحدہ قومیت کا جو تصور پیش کیا وہ اتنا ترقی یافتہ تھا کہ ہم آج بھی اس سے آگے نہیں بڑھ سکے۔ اس کے بعد جناب نسیم قریشی نے سرسید کے سیاسی فکر و عمل پر ایک مبسوط تقریر کی جس میں انھوں نے سرسید کی چالیس سالہ قومی زندگی کا مفصل جائزہ لیا اور ان روایات کی نشاندہی کی جو آج کے دور میں ترقی پسند سیاسی سلک کی تعمیر میں معاون ہو سکتی ہیں انھوں نے کہا کہ سرسید پہلے ہندوستانی ہیں جنھوں نے ایک پائدار اور استوار قومیت کا تصور پیش کیا۔ اس کے بعد پروفیسر عرفان حبیب نے سرسید تحریک کے معاشی پہلو پر مقالہ پڑھا جس میں اٹھارویں اور انیسویں صدی کے زمینداروں امراء اور شرفا کی سماجی اہمیت اور مدرستہ العلوم میں ان کے رول کا تجزیہ کیا گیا تھا۔

سیمنار کا چوتھا اور آخری اجلاس ۱۷ر جنوری کو سہ پہر میں جناب فضل الرحمٰن صاحب پرو وائس چانسلر کی صدارت میں شروع ہوا۔ ڈاکٹر محمود الحق نے اپنا مقالہ "سرسید مفسر قرآن کی حیثیت سے" پڑھا تھا۔ مقالہ میں ڈاکٹر محمود الحق نے کہا کہ سرسید ایک جدید علم الکلام کی ضرورت محسوس کرتے تھے اور جس طرح شاہ ولی اللہ کے نزدیک شریعت تغیر پذیر ہے اسی طرح سرسید بھی شریعت کو تغیر پذیر سمجھتے تھے۔ اس کے بعد پروفیسر آل احمد سرور نے اپنا جامع اور مبسوط مقالہ سرسید کا تہذیبی تصور اور موجودہ دور میں اس کی معنویت پڑھا۔ مقالہ میں سرور صاحب نے فرمایا کہ سرسید کا تہذیبی تصور ان کا بنیادی تصور ہے اور دوسرے پہلو یعنی مذہبی، ادبی، سیاسی، معاشرتی اسی تہذیبی تصور کی شاخیں ہیں۔ اس تہذیبی تصور میں اس دور کی جدیدیت، ہندوستانیت اور مذہبیت تینوں کا امتزاج ملتا ہے انھوں نے کہا کہ سرسید کا تہذیبی تصور دین کے دنیوی پہلو پر خاص طور سے توجہ کرتا ہے چنانچہ سرسید نے جب یہ کہا کہ دنیا چھوڑنے سے دین بھی جاتا ہے تو در اصل یہی سیکولرزم کا نقطہ آغاز ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج کے دور میں وہی تہذیبی تصور جامع کہلائے گا جس میں جدیدیت ہندوستانیت اور اسلام کا امتزاج ہوگا اس مقصود کے حصول کی راہ میں سرسید ایک روشن مینار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے بعد پروفیسر انوار الحق حقی نے سرسید کے سیاسی افکار پر تقریر کی اور ان کی تحریروں کا آربندو گھوش اور لالہ لاجپت رائے کی تحریروں سے موازنہ کرتے ہوئے کہا کہ سرسید نے مسلمانوں کی فلاح کا جو کام شروع کیا تھا وہ آج بھی باقی ہے انھوں نے کہا کہ جس طرح امریکہ میں یہودی قوم POLICY OF LOW PROFILE پر چل رہی ہے اسی طرح ہندوستانی مسلمانوں کو بھی یہ راستہ اختیار کرنا مفید ہوگا اس کے بعد ڈاکٹر نور الحسن نقوی نے سرسید کا تصور تعلیم اور موجودہ دور میں اس کی اہمیت کے عنوان سے مقالہ پیش کیا انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ سرسید کے کارناموں میں بنیادی اہمیت ان کے تعلیمی افکار اور اس کے نفاذ کو حاصل ہے جدید تعلیم کو رائج کرنے کے لئے انھوں نے مذہب کا مروجہ تصور بدلا۔ اس کے بعد جناب فرخ جلالی نے "سرسید کی تعلیمی تحریک اور اس کا نفاذ علیگڈھ میں" کے عنوان سے مقالہ پڑھا جس میں سرسید کی تعلیمی خدمات کا جائزہ لیا اور ان کی راہ میں جو دشواریاں حائل تھیں ان کا تجزیہ کیا سیمنار کا آخری مقالہ "سرسید کے مذہبی افکار" پر ڈاکٹر نور نبی نے پڑھا۔ آخر میں پروفیسر آل احمد سرور نے مقالہ نگاروں اور حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا کہ ان تین دنوں میں سرسید کے افکار و خیالات کے مختلف پہلوؤں پر اٹھارہ مقالے پڑھے گئے۔ اس سیمنار کا مقصد دور حاضر میں سرسید کی معنویت اور سرسید کی معنویت کے ذریعہ سے اپنی معنویت تک پہنچنا تھا خوشی کی بات ہے کہ اس سلسلہ میں مقالوں سے اور

بحث و مباحثہ سے جو پہلو سامنے آئے ہیں وہ مفید اور نئے ہیں ہمیں امید ہے کہ یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ آخر میں یہ تجویز متفقہ طور پر منظور کی گئی :

یہ سیمینار یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد سے درخواست کرتا ہے کہ سر سید کی ساری تصانیف کو مناسب حواشی اور شرحوں کے ساتھ دوبارہ شائع کیا جائے، سر سید کی ایک نئی سوانح عمری لکھوائی جائے اور سر سید کے ہندوستان کی تہذیبی، مذہبی، سیاسی اور ادبی زندگی پر اثرات کا سیر حاصل جائزہ لیا جائے۔

سیمینار کے سارے مقالات اور بحث کا خلاصہ شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی شائع کرے گا۔

• نامہ نگار

ادبی ٹرسٹ کا ایک لاکھ روپیہ کا نشانہ مکمل ہوگیا

ادبی ٹرسٹ حیدرآباد کے ارکان کا اجلاس ۱۵ر جنوری کو ۵ بجے شام اردو ہال میں جناب ایل۔ این گپتا صاحب صدر نشین ٹرسٹ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اجلاس میں مسرز حبیب الرحمان، حامد علی عباسی، ڈاکٹر سعید المنان، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اور مسٹر عابد علی خاں مینیجنگ ٹرسٹی نے شرکت کی۔

جناب عابد علی خاں نے گذشتہ اجلاس کی روداد اور ٹرسٹ کے آڈٹ شدہ حسابات پیش کرتے ہوئے بتلایا کہ کارپس فنڈ میں (۱،۰۷۷۷۹-۵۶) روپیہ جمع ہیں۔ ٹرسٹ نے کتابوں کی اشاعت کے لئے (۱۰) دس ہزار روپیہ مختص کئے تھے۔ تین کتابوں "غالب اور حیدرآباد" ڈاکٹر رضیہ اکبر حسن کی کتاب "تاثرات سفر ایران" اور کرشن چندر کے افسانے "الجھی لڑکی کالے بال" کی اشاعت کے بعد کتابوں کی مالیت اور نقد سلک (۱۱۶۰۸-۴۵) روپیہ ہے بکڈپو پر کوئی سرمایہ نہیں لگایا گیا تھا۔ بکڈپو کے کھاتہ میں نقد اور بکڈپو میں موجود کتابوں کی مالیت (۹۴۹۰۲-۱۵) ہے۔ اس طرح ادبی ٹرسٹ کے تینوں کھاتوں میں جملہ (۱۲۴۴۳۰۸-۳۶) ہیں۔

ٹرسٹ کے اغراض و مقاصد میں ادیبوں کی امداد اہم ہے۔ سابق میں ارکان نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ٹرسٹ کارپس فنڈ میں ایک لاکھ روپیہ جمع ہونے کے بعد ٹرسٹ اپنے اس مقصد کی تکمیل کے لئے قدم اٹھائے گا اب ٹرسٹ کے کارپس میں ایک لاکھ ۷ ہزار روپیہ ہو چکے ہیں۔ اس لئے یہ طے کیا گیا کہ کارپس کی سالانہ آمدنی میں سے (۵) ہزار کی حد تک اس مقصد کے لئے ہر سال خرچ کیا جائے۔ اس میں سے دو ہزار روپیہ ادیبوں کی شدید ضرورت پر فوری مدد کے لئے مختص کئے جائیں اور تین ہزار روپیہ ادیبوں کی تخلیقات کی اشاعت کے لئے بطور اعانت صرف کئے جائیں۔ اس ضمن میں ٹرسٹ کے رکن اور مشیر قانونی جناب رمن راج صاحب سکینہ ضروری قواعد مرتب کر رہے ہیں۔

جلسہ میں یہ بھی طے کیا گیا ٹرسٹ کا اپنا اشاعتی کاروبار فی الوقت ملتوی رکھا جائے۔

بکڈپو کے بارے میں یہ طے کیا گیا کہ محدود منافع کے باوجود اسے محض اس لئے تجارتی رکھا جائے کہ معیاری کتابوں اور رسائل کی فروخت کے لئے اسے کل ہند اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ ملک بھر کے ممتاز ادیب و شاعر اپنی تصنیف کی حیدرآباد میں نکاسی کے لئے اس بکڈپو سے رجوع ہوتے ہیں اور کئی ادیب اپنی کتابوں کے حاصل کرنے کے لئے ادبی ٹرسٹ بکڈپو کا پتہ دیتے ہیں۔ اردو داں حضرات سے یہ درخواست کی جاتی ہے کہ اپنے لئے یا کتب خانوں کی خاطر کتابوں کی فراہمی کے لئے بکڈپو کو خدمت کا موقع دیں۔

ادبی ٹرسٹ نے (۵) سال کی مختصر سی مدت میں صرف چار مشاعروں، ساونیر، اور نقاس چیریٹی ٹرسٹ، وزیر سلطان ٹبا کو کمپنی اور حکومت کشمیر کے عطیوں سے ایک لاکھ روپیہ سے زائد روپیہ جمع کیا ہے یہ ملک بھر میں اپنی نوعیت کا پہلا ٹرسٹ ہے۔

ارباب ٹرسٹ کو یہ امید ہے کہ ریاستی حکومت اور مرکزی حکومت بھی اس کام میں تعاون کرے گی تاکہ کارپس بڑھے اور زبان و ادب اور ادیبوں کی زیادہ سے زیادہ خدمت ہوسکے۔

ٹرسٹ کے اجلاس نے سال رواں کے خرچ میں یہ تصفیہ کیا کہ ادیبوں کی خصوصی امداد کی مد سے سلیمان اریب مرحوم کے فرزندوں کے لئے محترمہ صفیہ اریب کی خدمت میں ایک ہزار کی رقم پیش کی جائے اور حیدرآباد کے دو ممتاز شاعروں اوج یعقوبی اور ابن احمد تاب صاحب کے منتخبہ کلام کی اشاعت کا انتظام کیا جائے!

• عابد علی خاں

اردو کی ترقی کے لئے سہولتوں کی یقین دہانی

لکھنؤ۔ کونسل ہاؤس میں اردو اکاڈمی کا افتتاح کرتے ہوئے وزیر اعلا کملا پتی ترپاٹھی نے کہا کہ ریاستی حکومت اردو کی ترقی اور تعلیم کے سلسلے میں زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کرے گی تاکہ ریاست کے ان لوگوں کو جن کی مادری زبان اردو ہے کسی قسم کی شکایت کا موقع نہ پیدا ہو۔

انھوں نے کہا کہ سابق ریاستی حکومتیں بھی اردو کی ترقی پر توجہ دیتی رہی ہیں لیکن کہا جاتا تھا کہ سب باتیں کاغذ پر ہوتی

ہیں ان پر عمل نہیں کیا جاتا۔ اب عملی اقدام کے طور پر یہ اکاڈمی قائم کی جا رہی ہے۔

جناب ترپاٹھی نے پرائمری درجات سے اعلیٰ سطح تک اردو کی تعلیم کی سہولتیں فراہم کئے جانے کی یقین دہانی کے ساتھ ہی یہ بات بھی واضح کر دی کہ اردو کو ریاست کی دوسری زبان کا درجہ دینا ممکن نہ ہو سکے گا۔ انھوں نے اس سلسلے میں کہا "صوبے اور ملک کی بھلائی اسی میں ہے کہ ریاست کی زبان ایک ہی ہو"۔

وزیر اعلیٰ نے کہا کہ اکاڈمی کا خاص کام حکومت کو یہ مشورہ دینا ہوگا کہ اردو کی ترقی کیسے ہو اور اس معاملے میں صرف کاغذ ہی پر نہیں عملی طور پر کیا اقدامات کئے جائیں۔

وزیر اعلیٰ نے کہا کہ اکاڈمی کی اہمیت کے مدنظر اسے ایک خود مختار ادارہ بنا دیا گیا ہے اس طرح یہ سرکاری لال فیتے کے چکر سے باہر ہو گئی ہے تاکہ کاموں میں دیر نہ لگے۔ انھوں نے کہا "اکاڈمی جو کچھ کہے گی وہ سب کا سب مان لیا جائے گا یہ تو میں نہیں کہہ سکتا لیکن جو مناسب باتیں اکاڈمی اردو کی ترقی کے لئے کہے گی ان کو حکومت ضرور پورا کرے گی"۔

وزیر اعلیٰ نے کہا کہ جہاں تک ان کو معلوم ہے اتر پردیش میں یہ اپنے قسم کی پہلی اکاڈمی ہے ہندوستان کی کسی دوسری ریاست میں ابھی تک کوئی اردو اکاڈمی نہیں قائم ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ اس ریاست میں اس کی ضرورت بھی تھی کیونکہ کچھ لوگوں نے یہ غلط فہمی پھیلا رکھی تھی کہ اتر پردیش میں جہاں اردو پیدا ہوئی اور پھلی پھولی اردو کے خلاف کوئی تحریک چل رہی ہے واقعہ یہ نہیں ہے اور اسی لئے ہم نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی۔

وزیر اعلیٰ نے کہا "اردو ہماری زبان ہے اس معاملے کو ہندوؤں یا مسلمانوں کی طرف سے فرقہ وارانہ رنگ دیا جائے تو یہ ملک کے ساتھ دشمنی کرنا ہوگا۔ اردو بولنے اور لکھنے پڑھنے والوں میں ہندو، مسلمان بلکہ سبھی شامل ہیں۔ آج سے نہیں سیکڑوں برسوں سے بہت سے مسلمانوں نے ہندی میں شاعری کی ہے اور بہت سے ہندوؤں نے اردو کو اپنایا ہے یہ ہمارے صوبے کی زبان ہے۔ ہمارے ملک میں جو ایک ملی جلی تہذیب پیدا ہوئی یہ اسی کا ایک نمونہ ہے۔ جو لوگ اس معاملے کو فرقہ وارانہ رنگ دیتے ہیں ان کا مقصد ملی جلی قوم میں تفرقہ پیدا کرنا ہے مذہب کی بنیاد پر قومیں دو نہیں ہو جاتیں۔ بول چال کے فرق ہو جانے سے قومیں بٹتی نہیں ہیں ایک ہی رہتی ہیں۔

وزیر اعلیٰ نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا "ہم یہ مان کر چلتے ہیں کہ اردو ہمارے صوبے کی زبان ہے اور یہیں پیدا ہوئی ہے۔ میں ہندی کا بھگت ہوں یہ آپ سب جانتے ہیں۔

کبھی کبھی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ میں ہندی والا ہوں میں ضرور ہندی والا ہوں مگر اس کے ساتھ ہی مجھے اردو سے بھی محبت ہے کیونکہ مجھے اپنے ملک سے محبت ہے۔ ہمارے ملک میں بہت سی زبانیں ہیں ان کی وجہ سے ہندوستان کی خوبصورتی بڑھی ہے اور یہ سب زبانیں ہم کو عزیز ہیں۔

"اردو پڑھنے پڑھانے کی جو دقتیں ہوں میں چاہتا ہوں کہ وہ دور ہوں یہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں ہے۔ مگر بہر حال ان دقتوں کو یکبارگی تو نہیں دھیرے دھیرے دور کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ جن بچوں کے ماں باپ پرائمری سطح پر اردو میں تعلیم دلوانا چاہتے ہیں اس کا انتظام کیا جائے گا میں نے وزیر تعلیم سے بات چیت کی ہے اور اس کی ایک اسکیم جلد ہی آئے گی۔

میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ اردو میں لکھی ہوئی درخواستیں عدالتوں اور دفتروں میں لی جائیں گزٹ اور قانون وغیرہ بھی اردو میں چھپیں ہم اردو کی کتابیں چھپوائیں اور ہر طرح اس خوبصورت اور شاندار زبان کی جو ہماری زبان ہے زیادہ سے زیادہ ترقی ہو سکے۔

"جن کی مادری زبان اردو ہے انھیں سہولت ملنی چاہئے انھیں اونچی سے اونچی تعلیم اور ڈگریاں اردو میں حاصل کرنے کا موقع ملنا چاہئے ہماری خواہش ہے کہ ہم اس طرف تیزی سے قدم اٹھائیں۔ اکاڈمی کی مدد سے ہم اپنی منزل پر پہنچنے میں مدد ملے گی۔

وزیر اعلیٰ کی تقریر سے قبل وزیر ریاست اور اکاڈمی کی صدر بیگم حامدہ حبیب اللہ نے کہا کہ اکاڈمی اردو کی ترقی کی جدوجہد کرے گی انھوں نے کہا کہ حکومت کو جب بھی اردو پڑھنے پڑھانے کے سلسلے میں دشواریوں کا پتہ چلے گا وہ ان کو دور کرنے کی کوشش کرے گی۔

• قومی آواز

اردو بھی ذریعہ تعلیم ہو سکتی ہے

لکھنؤ۔ وزیر اعلیٰ جناب کملاپتی ترپاٹھی نے یو۔پی اسمبلی میں ایک کانگرسی ممبر کے سوال کے جواب میں کہا کہ اردو ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے اپنا جائز مقام جاری رکھے گی۔

انھوں نے یہ بھی کہا کہ اردو اکاڈمی جو حکومت نے ابھی حال ہی میں پانچ لاکھ رقم منظور کر کے قائم کی ہے وہ اردو کی خدمت کرتی رہے گی۔

وزیر اعلیٰ نے کہا کہ اگر کسی درجہ میں کم سے کم پانچ لڑکے اردو پڑھنے کے خواہشمند ہوں تو متعلقہ اسکول کو ایک اردو ٹیچر فراہم کرنا ہوگا اور اگر کسی ادارے میں ۱۲ لڑکے اردو پڑھنے کے خواہشمند ہوں گے تو ان لڑکوں کے لئے اردو زبان دوسرا ذریعہ تعلیم ہو سکتی ہے حکومت نے ایسے اداروں کے لئے معقول مالی امداد کا انتظام کر دیا ہے۔ • قومی آواز

ناگری حروف میں اردو شاعری کی مقبولیت

کانپور:۔ پارلیمنٹ کے ممبر جناب ارجن اروڑا نے پریس کلب میں یہ انکشاف کیا کہ ہندی کو کٹھن زبان بنانے کی وجہ سے ہندی کے شاعروں اور کہانی کاروں کی کتابیں کم فروخت ہوتی ہیں اس کے برعکس ناگری میں شایع ہونے والے اردو شاعری کے مجموعے زیادہ فروخت ہوتے ہیں۔

انھوں نے کہا کہ میں نے دہلی میں پاکٹ بک شایع کرنے والی کمپنیوں کے مالکوں سے رابطہ قائم کیا تو پتہ چلا کہ سب سے زیادہ وہ کتابیں فروخت ہوتی ہیں جن میں غالب سے کرشن تک اردو شاعروں کے انتخاب، غزلیں اور نظمیں ناگری حروف میں شایع کی جاتی ہیں جناب اروڑا نے زور دیا کہ ہندی کو عوام کی زبان بنانے کی کوشش کی جائے۔

انھوں نے کہا کہ ہندی کو کسی پر جبری طور سے ٹھونسنا غلط ہوگا جو بھی ایسی کوشش کرے گا وہ ملک سے دشمنی کرے گا چاہے وہ سیٹھ گووند داس ہو یا گلزاری لال نندا ہو۔

انھوں نے یاد دلایا کہ پاکستان کے حکمرانوں نے بنگلہ دیش پر زبردستی اردو کو ٹھونسنا چاہا جس سے عوام میں نفرت کا جذبہ پیدا ہوگیا۔

جناب ارجن اروڑا نے کہا کہ بنگلہ دیش کی آزادی اور سیکولر حکومت سے شمالی ہندوستان اور خاص طور پر یوپی کو سبق لینا چاہئے اور اردو کو اس کا جائز مقام دینا چاہئے تاکہ اقلیتی عوام بھی ملک کے سماجی ڈھانچے کو بدلنے کی جدوجہد میں یکسوئی سے شرکت کرسکیں۔

• قومی آواز

انجمن ترقی اردو کا سالانہ اجتماع

حیدرآباد:۔ جناب سرخیو اس لاہوتی معتمد تنظیم انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے اپنے صحافتی بیان میں انجمن کی شاخوں سے اپیل کی ہے کہ وہ جلد از جلد مقامی طور پر جلسے منعقد کرکے اردو کی تائید میں رائے عامہ ہموار کریں تاکہ ڈگری کی سطح پر کالجوں میں اردو کو اس کا مستحقہ مقام مل سکے جس کے بارے میں حکومت بالکل خاموش ہے اور اردو والوں میں بے چینی پھیلی ہوئی ہے جناب لاہوتی نے انجمن کی شاخوں کے علاوہ اردو کے کارکنوں اور ہمدردوں سے بھی اپیل کی ہے کہ وہ انجمن کے سالانہ اجتماع جو ۱۲ر اور ۱۳ر فروری کو حیدرآباد میں منعقد ہونے والا ہے اس میں شرکت کرنے والوں کے نام فوری صوبائی مرکز کو روانہ کریں تاکہ مندوبین کے قیام و طعام کے انتظامات میں سہولت ہوسکے۔ اضلاع کے مندوبین کے قیام کا انتظام اردو ہال حمایت نگر میں کیا جارہا ہے

• نامہ نگار

اردو اساتذہ کی ترقی کے لئے ٹیچرس یونین کی سعی

حیدرآباد:۔ اسٹیٹ ٹیچرز یونین حیدرآباد سٹی برانچ کے سکریٹری جناب ایم. گوپال نے اپنے ایک بیان میں کہا ہے کہ انھوں نے ڈسٹرکٹ ایجوکیشنل آفیسر حیدرآباد سے نمایندگی کی ہے کہ اردو زبان کے اساتذہ کی ترقی کے احکام فوری جاری کئے جائیں۔ جناب گوپال نے کہا انھیں یقین دیا گیا ہے کہ اس ہفتہ احکام اجرا کردئے جائیں گے۔

• سیاست حیدرآباد

انجمن ترقی اردو نلگنڈہ کے انتخابات

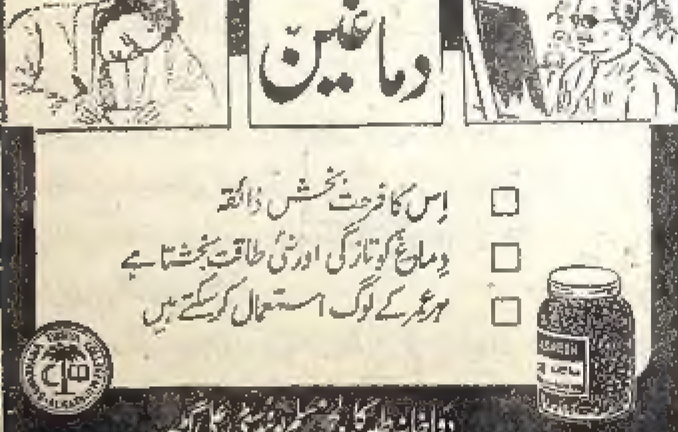
نلگنڈہ:۔ انجمن ترقی اردو نلگنڈہ کا اجلاس جناب پی. وینکٹ رنگا راؤ ایڈوکیٹ کے زیر صدارت منعقد ہوا۔ اجلاس میں انجمن کے لئے عہدہ داروں کا انتخاب عمل میں آیا جناب پی. وینکٹ رنگا راؤ (صدر)، ڈاکٹر جے ایم خاں، عبداللطیف ایڈوکیٹ اور بندراین ساہو (نائب صدر)، سید محمد یحییٰ قادری (معتمد)، محمد غوث صدیقی اور سید اکرام حسین ترمذی لکچرر (نائب معتمدین) اور خواجہ معین الدین (خازن) منتخب ہوئے۔

• سیاست حیدرآباد

اسلم آزاد کے زیر صدارت تعزیتی جلسہ

پٹنہ:۔ بہار ریاستی اردو اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی ایک غیر معمولی تعزیتی نشست زیر صدارت پروفیسر اسلم آزاد منعقد ہوئی۔ جلسہ میں جناب غلام السیدین اور جناب عادل رشید کی ناگہانی موت پر اظہار افسوس کے ساتھ خراج عقیدت پیش کیا گیا۔

• افتخار حسین معتمد



کہہ رہے ہیں۔ ایک مصرعہ مشکل گرفت میں آسکا۔ "مرشیں گے گر کوئی بر پکارا ہوا" ایسی بھی کیا جلدی ہے یار! ذرا ٹھہر کر پڑھو کوئی کہہ رہا ہے۔ واہ صاحب اٹھئیے دو کانیں بند ہو جاتی ہیں۔ مقطع لاتا ہے کسی نے سرگوشی کی۔

ساحل مانکپوری کے نام کا اعلان ہوا۔ انھوں نے ابھی تک اپنا اونی کنٹوپ نہیں اتارا۔ اس کو دیکھیں کہ اس کی بات نہیں۔ زاہدہ زیدی کہتی ہیں کہ کیا آجکل لڑکے لڑکیاں نہایت نیک اور رحمدل ہو گئے ہیں۔ واقعی ٹھیک کہتی ہیں۔ ساحل صاحب بخیر و سلامتی واپس چلے گئے۔ ان کا ایک شعر یوں تھا۔

لا تا بھی یہ گریۂ شبنم ضرور رنگ   اچھا ہوا کہ پھول کو ہنسا سکھا دیا

کالی شیروانی۔ کالی ٹوپی۔ واضح آواز۔ دو غزلیں۔ ایسے اشعار

چلئے مان لیتا ہوں میری بات جھوٹی ہے   آئینہ تو کم سے کم آپ دیکھتے ہوں گے

شام کے اجالے کیوں لوٹ کر نہیں آتے   صف بصف اندھیروں سے مات کھا گئے ہوں گے

یہ شہاب جعفری تھے جن کو مناسب داد ملی۔ دوسرا شعر سرور صاحب نے دوبارہ پڑھوایا۔

اب فوق کریمی اپنی نظم "آگ کا دریا" پڑھ رہے ہیں۔ ایک صاحب نے چپکے سے کہا یہ آگ کا دریا سامعین کے لئے ہے دوسرے نے بات مکمل کی "اور ڈوب کے جانا ہے" پھر فوق کریمی نے غزل سنائی اس شعر کو پسند کیا گیا

آپ نے اشک محبت کو چھپایا تو بہت   پھر بھی رخسار پہ ہلکی سی نمی باقی ہے

ان کے بعد غلام مرتضیٰ راہی اپنی غزلیں سنا رہے ہیں۔ ابھی حال ہی میں علی گڑھ میں بسلسلۂ ملازمت آئے ہیں۔ جب انھوں نے یہ شعر پڑھا۔

ڈوبے ہوئے مکان کی چھت پر کھڑا تھا میں   منظر میں نقش آب دکھایا گیا مجھے

وحید اختر، منظر عباس نقوی سے کہہ رہے ہیں کہ منظر صاحب یہ شعر آپ بطور خاص سنیں۔۔۔ غلام مرتضیٰ راہی نے دو غزلیں پڑھیں اور ان کے کئی اشعار پسند کیے گئے۔

ضیا جائسی نے بڑے سلیقے سے ٹھہر ٹھہر کر دو غزلیں سنا کر داد تحسین حاصل کی، دونوں غزلوں کے ایک ایک شعر درج ہیں۔

دن تو سارا ہی کٹا مثل چراغ کشتہ   گرمیٔ جسم سر شام جلا دے مجھ کو

شکست و ریخت کی دنیا میں ہوں تو خواہش ہے   خیال بکھرا ہوا جسم ٹوٹتا مل جائے

اب بشیر بدر کے نام کا اعلان ہوا۔ ابھی لکھنے والوں کی ایک مقامی انجمن کی تشکیل کی مخالفت کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ شاعری آمنا ذاتی عمل ہے کہ اسے آٹھ دس آدمیوں کے سامنے بحث و تنقید کے لئے پیش کرنا عبث ہے لیکن وہ یونیورسٹی کے مختلف ہال کی شعری نشستوں میں بڑی باقاعدگی سے شریک ہوتے ہیں۔ اس کو وہ "مذہبی فرض" بتاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ان میں یہ خوبی ابھی موجود ہے کہ ان کے ذریعے لوگ شعر و ادب سے دلچسپی لے سکیں۔ لیکن ویسے وہ اپنی شاعری سے غیر متعلق ایک الگ فرض یا کام بتاتے ہیں۔ اطمینان اور اعتماد کے ساتھ اشعار سنا رہے ہیں۔

میں آسمان و زمین کی حدیں ملا دیتا   کوئی ستارہ اگر جھک کے چومتا مجھ کو

چمک گئے مرے تلوے سے پھول شیشے کے   زمانہ کھینچ رہا تھا برہنہ پا مجھ کو

تو ایک بانجھ میں ہے آگ ایک میں پانی   تمام رات ہوا میں جلا بجھا مجھ کو

اب وہ داد کے شور میں واپس جا رہے ہیں۔ شمیم حنفی، بشیر بدر سے کہہ رہے ہیں کہ یہ شعر کیوں نہیں سنایا۔

بلا کے رات کا رس دو کشش بتاتی تھی   سویرے لوگوں سے کہتی تھی دیکھنا مجھ کو

میکش بدایونی عاشقانہ بے چارگی کے ساتھ اس شعر پر داد حاصل کر رہے ہیں۔

خود پرستی نے کہیں کا بھی نہ رکھا ہم کو   آن کے در سے بھی گئے، دیر و حرم بھی گئے

ناصر الدین شعبۂ انگریزی میں لکچرر ہیں۔ سلیقے سے سوٹ پہنتے ہیں مگر اصلی شاعروں کی طرح مفلر لہراتے ہوئے اچھا شعر پڑھ رہے ہیں

میں تری کھوج میں جب گھر سے چلا خاک ہوا

میں ترے شہر میں پہنچا تو بگولہ بن کر

مکتبہ جامعہ شاخ علی گڑھ کے منیجر زکی کھاکوی یہ شعر پڑھتے ہیں۔

شعلہ کلفت میں میرے گناہ   رحمت برسے خاطر خواہ

ہمایوں ظفر زیدی نے دو اچھی غزلیں سنائیں۔ یہ شعر آپ بھی دیکھیں۔

درد تنہائی تو میری ذات کا مقسوم تھا   تو مگر اس بات سے کیوں اس قدر مغموم تھا

اب ڈاکٹر مسعود حسین خاں، صدر شعبۂ لسانیات اپنی نظم "بنگلا دیش" پڑھ رہے ہیں۔ یہ ان کی نظم دس بارہ سال قبل کی ہے۔ اس نظم میں دو کردار ہیں ایک افغانی مرد کا جو کوہستانوں کی صلابت کا متلاشی ہے اسے بنگال کی نرم و نازک اور ساونی موسیقی میں حسن بیمار نظر آتا ہے اور دوسرا کردار اس بنگالی لڑکی کا ہے جو کومل گیتوں اور دھان کے کھیتوں کی تازگی ہے۔ دونوں کی فطرت میں جو بنیادی تضاد ہے اسے اس نظم میں پیش کیا گیا ہے۔ اس نظم کی معنویت اب اور زیادہ نمایاں ہوئی۔

شمیم حنفی نے دو غزلیں بڑے سکون سے سنائیں جن میں ایسے اچھے اچھے اشعار تھے۔

دل کی قسمت وہی دن رات کی آشفتہ سری   اور آنکھوں کو یہی ضد ہے کہ گھر جانا ہے

سب کی آنکھوں میں کسی بادیٔ موہوم کا خواب   کون بتلائے کہ اس وقت کدھر جانا ہے

ہمارے اجداد کی کہانی، سنا رہا ہے ندی کا پانی

کئی صداؤں نے خون تھوکا، کئی بدن سنگ سار دیکھے

ظہیر صدیقی جو شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی میں ریڈر ہیں وہ بھی تشریف لے آئے تھے اور اب غزل سرا ہیں۔

سیلانی کو پھر آئی ہے آج وطن کی یاد

کاش ذرا پہچوسے نواز سے بیگانوں کا شہر

شہریار کہہ رہے ہیں کہ دو غزلوں کے کچھ اشعار پیش کرتا ہوں۔

سرگوشیوں کے سبز بدن زرد ہو گئے   جگنو سکوت شام کے بستر پہ دیکھ کر

کہیں بکھر دیں کہیں دائروں میں بٹنے لگی   زمین تو اب ہر اک آن کچھ سمٹنے لگی

طلسم ٹوٹنے ہی والا تھا کہ ہم نے سنا   ہوائے شہر وفا ایک نام رٹنے لگی

شہریار کے ان اچھے اشعار کے بعد زاہدہ زیدی نے دو نظمیں پڑھیں ان دونوں نظموں میں فرد اور اس کے دور کے انتشار کو جدید حسیت کے ساتھ پیش کیا گیا تھا۔ زاہدہ زیدی کے بعد ساجدہ زیدی نے دو نظمیں پڑھیں۔ ان کی نظم "مشرق و مغرب کا نقطۂ اتصال" بہت پسند کی گئی۔ اس نظم میں مشرق و مغرب کا جذباتی موازنہ کرنے کے بجائے اس

(باقی صفحہ ۲ پر)

ہم سے کتنے ہیں علی گڑھ کے وفاداروں میں

(یومِ جمہوریت کے مشاعرے کا ایک رپورتاژ)

(علی گڑھ میں شعری نشستیں اور مشاعرے اکثر ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ان نشستوں میں ایسے نئے چہرے بھی اکثر نظر آتے ہیں جو دو چار بار جھلک دکھا کر روپوش ہو جاتے ہیں۔ سال میں کم از کم ایک بار اتنا بڑا مشاعرہ بھی ہوتا ہے جس کا بجٹ دس ہزار روپے سے زیادہ ہی ہوتا ہے لیکن اس بڑے مشاعرے اور دیگر نشستوں میں وہ شعرا شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں جن کی وجہ سے علی گڑھ ادبی حلقوں میں اپنی انفرادیت کے ساتھ جانا پہچانا جاتا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ عام مشاعروں کے باقاعدہ شاعروں نے ہزاروں سامعین کی اجتماعی نفسیات کے تابع ہو کر ایسی واضح، برجستہ اور عام فہم چیزیں پیش کرنے میں اپنی عافیت سمجھی ہے جس سے ان کو زیادہ سے زیادہ مقبولیت حاصل ہو۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج کل مشاعروں میں اچھے ترنم، سطحی اور سستے عشقیہ جذبات والی غزل یا بیانیہ انداز کی پرجوش خطابیہ نظم کا نیا دیتی ہے۔ یہ شعرا اپنے عہد کے مزاج، بدلتی ہوئی زندگی کی تہہ داریوں اور ادبی ارتقا و تغیر کو سمجھنے کے بجائے مشاعرے کی کامیابی کے طے شدہ اور آزمودہ نسخے کو آزمانا ہی بہتر سمجھتے ہیں اور ہر مشاعرے کی کامیابی کی ضمانت سمجھے جاتے ہیں۔ آج ہمارے بڑے مشاعروں میں ایسے شاعر کم ہی شریک ہوتے ہیں جن کی ادب میں بھی کوئی نمایاں حیثیت ہو اور مشاعروں میں بھی انھیں احترام سے سنا جاتا ہو۔ ترقی پسند شاعروں نے مشاعروں میں کسی حد تک کامیابی حاصل کی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ سردار جعفری، کیفی اعظمی، مجروح سلطان پوری، ساحر لدھیانوی، مخدوم محی الدین وغیرہ اپنی اچھی شاعری کو اسٹیج پر پیش کرنے کا ڈھنگ جانتے تھے۔ جدید شاعروں نے مشاعروں سے تقریباً خود کو غیر متعلق کر لیا ہے اور جن چند جدید شاعروں (مثلاً بشیر بدر، ندا فاضلی) نے ابھی تک یہ محاذ نہیں چھوڑا ہے انھیں مشاعروں میں طرح طرح کی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس صورت حال کا تاریک رُخ یہ ہے کہ علی گڑھ جو کبھی شعر و ادب کا ایسا مرکز تھا جہاں کے ہر طالب علم سے ایک معیار کی توقع کی جاتی تھی وہاں بھی عام طور پر اب سخن فہمی کا معیار 'مشاعرہ زدہ' ہو کر رہ گیا ہے۔ اور علی گڑھ کے اہم ترین شعرا یہاں کے مشاعروں اور نشستوں میں عام طور پر کم شریک ہوتے ہیں۔ صرف شعبۂ اردو کا ایک خاص مشاعرہ جو ۲۶ جنوری کو ہر سال منعقد ہوتا ہے یہ امتیازی حیثیت رکھتا ہے کہ اس مشاعرے میں تمام منتخب شعرا اور سامعین یکجا ہوتے ہیں۔ اس مشاعرے کے روحِ رواں پروفیسر آل احمد سرور ہیں۔ سب جانے پہچانے شاعروں کو وہ ذاتی طور پر مدعو کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ طلبہ اور نئے لکھنے والوں کی تلاش اور ہمت افزائی وہ بطور خاص کرتے ہیں۔ اس مشاعرے میں یونیورسٹی کے اہم اساتذہ اور طلبہ مدعو ہوتے ہیں۔ لوگوں کو سال بھر اس مشاعرے کا انتظار رہتا ہے۔ اس وجہ سے علی گڑھ کی ادبی زندگی میں اس مشاعرے کی بڑی اہمیت ہے۔)

آرٹس فیکلٹی کا کمرہ نمبر ۱۲۹ (جو ایک اوسط درجے کا ہال ہے) سادگی اور نفاست سے سجا ہے۔ شام کے چھ بج رہے ہیں۔ ہلکی ہلکی پھوار نے شاعروں اور سامعین کو شاید راستے ہی میں روک رکھا ہے۔ ابھی کم لوگ آئے ہیں۔ مشاعرہ کے آغاز کا وقت ہو رہا ہے اور پھوار تیز ہوتی جا رہی ہے۔ ساڑھے چھ بجے بارش رکی۔ لوگ تیزی سے آ رہے ہیں۔ کسی کے بالوں اور مفلر پر، کسی کے کوٹ کے کاندھے اور کالر پر بارش کی شبنم چمک رہی ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور سارے انتظامات کو خاموش نظروں سے پرکھ رہے ہیں۔ شاید آنے والے شعرا کی تعداد کا اندازہ لگا رہے ہوں۔ خواجہ مسعود علی ذوقی کے ساتھ مل کر شعرا کی فہرست ترتیب دے رہے ہیں۔ دروازہ پر آنے والے مہمانوں کا بشیر بدر خیر مقدم کر رہے ہیں۔ ذرا سی دیر میں کمرہ بھرا بھرا سا لگنے لگا۔ حاضرین میں عورتوں اور لڑکیوں کی تعداد بھی خاصی ہے۔ شام کے پونے سات بج رہے ہیں۔ پروفیسر آل احمد سرور مشاعرے کے آغاز کا اعلان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تقریباً دس سال سے یہ مشاعرہ یوم جمہوریہ کے موقع پر منعقد کیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس مشاعرے میں ایسی کوئی پابندی نہیں ہوتی کہ شعرا صرف یوم جمہوریہ سے متعلق موضوعاتی کلام سنائیں لیکن اس دن کی اہمیت کے احساس کے ساتھ یہ مشاعرہ ہوتا ہے۔ اس سال نہایت خوشی کا مقام ہے کہ ہندوستان نے جو اصول اپنائے تھے ان کی فتح ہوئی اور ایک ملک ہندوستان کی پُرخلوص مدد کی وجہ سے خاک و خون کے دریا سے گزر کر آزاد ہوا ہے۔ اب وہ اس مشاعرے کی چند امتیازی خصوصیات بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ شعرا کے پڑھنے کی ترتیب میں کسی درجہ اور مقام کو دخل نہیں ہے اور اب صلاح الدین پرویز اپنا کلام سنائیں گے۔ صلاح الدین پرویز انگریزی میں ایم۔اے کر رہے ہیں کئی سال سے تمام اچھے پرچوں میں ان کی نظمیں چھپ رہی ہیں ادبی حلقے انھیں جانتے ہیں۔ انھوں نے اپنی نظم 'آدھے، پورے اور درمیانی دائرے' سنائی۔ نظم تجریدی پیکروں کا ایک سلسلہ ہے لیکن اپنے ترنم آہنگ کی وجہ سے انھیں بھی متوجہ کرنے میں کامیاب ہوئی جو ابھی علامتی اسلوب سے پوری طرح مانوس نہیں ہوئے ہیں۔ اب احتشام اختر آتے ہیں۔ اردو میں ریسرچ کر رہے ہیں۔ پہلی بار ترنم سے غزل پڑھنی شروع کرتے ہیں۔ ان کے یہ اشعار لوگوں کو متوجہ کر لیتے ہیں۔

ہمیں ہے ناز کہ ہم ہیں پہاڑ کی مانند — ہماری آنکھ سے چشمے ابلتے رہتے ہیں
ہمارے ساتھ کہاں تک چلو گے صحرا گرد — کہ راستوں کی طرح ہم تو چلتے رہتے ہیں

اسی دوران ساحل مانکپوری داخل ہوتے ہیں اور آباد سے ایم۔اے کرنے کے بعد یہ اسی سال پی ایچ ڈی کرنے علی گڑھ آئے ہیں۔ ساحل مانکپوری ایسی تنکے میں اونی ٹوپی پہنے ہیں کہ لوگ ان کے بجائے ان کی ٹوپی کو دیکھنے لگتے ہیں۔ اب مرزا خلیل بڑی تیزی سے اپنا کلام سناتے ہیں۔ شاید اسی لمحۂ غنیمت میں دل و دماغ کی ساری کہانی جلد از جلد کہہ جانا چاہتے ہیں۔ لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ کیا

(باقی آئندہ)

مالک انجمن ترقی اردو ہند (علیگڑھ) پرنٹر و پبلیشر سید تفضل حسین ایم۔اے نے لیتھو کلر پرنٹرس علیگڑھ میں چھپایا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند (علیگڑھ) سے شائع کیا